Research Journal
Tahqeeqat

eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334

ریسرچ جرنل
تحقیقات

فنِ ترجمہ نگاری اور اردو زبان وادب میں تراجم کی روایت: ایک جائزہ

The art of translation and the tradition of translations in Urdu literature: a review

Dr. Arshad Mehmood
Islamabad Model College for Boys, G-7/2, Islamabad

ڈاکٹر ارشد محمود
اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلبہ ، جی سیون ٹو، اسلام آباد

Abstract

Interpretation is the method of rendering content or discourse from one dialect into another whereas protecting its meaning, tone, fashion, and expectation. It includes exchanging the substance of a source language (the dialect of the initial content) into a target dialect (the dialect into which the content is being deciphered). Interpretation can happen in different shapes, counting composed writings, talked exchange, and mixed media substance. The objective of translation is to precisely pass on the message of the initial content whereas guaranteeing that it is comprehensible and socially suitable for the group of onlookers of the target dialect. Interpreters must have capability in both the source and target dialects, as well as an understanding of the social settings related with both languages. They frequently confront challenges such as idiomatic expressions, social references, and phonetic subtleties that will not have coordinate counterparts within the target dialect. The craftsmanship of interpretation requires a blend of phonetic mastery, social affectability, inventiveness, and moral judgment to bridge the crevice between dialects and societies whereas protecting the astuteness of the initial content. The convention of interpretation in Urdu writing includes a wealthy and assorted history that ranges centuries. Urdu writing, like numerous other scholarly conventions, has been enormously impacted by interpretations of works from other dialects, especially Persian, Arabic, Turkish, and English. In general, the convention of interpretation in Urdu writing reflects the energetic trade of thoughts and social impacts that have formed Urdu scholarly expression over the centuries. Interpretations have played a crucial part in enhancing Urdu writing, broadening its scope, and cultivating cross-cultural understanding.

Keywords: *The soul, Terminology, Creation, The minimalist, Journalistic, translator, sin, The Odyssey, natural, impression.*

کلیدی الفاظ: روح، اصطلاحات، تخلیق، مرصع ساز، صحافتی، مترجم، گناہ، اوڈیسی، طبع زاد، تاثر

معاشرے میں ہر سطح پر، ہر شعبہ زندگی میں لین دین روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔ انسانی زندگی کی بقا اسی لین دین اور ادل بدل میں مضمر ہے۔ علم و ادب، ثقافت، معاشرت ہر شعبے میں اخذ و قبول کا سلسلہ ابتدا سے ہی جاری ہے۔ انسان جو بھی زبان بولتے ہیں ان کی ہر زبان کی زندگی بھی دوسری زبانوں کے ساتھ الفاظ کے لین دین اور اخذ و قبول ہی میں پوشیدہ ہے۔ اگر زبانوں میں یہ لین دین اور اخذ و قبول کا یہ عمل رک جائے یا روک دیا جائے تو کوئی زبان بھی زندہ نہ رہے اور اپنے بولنے والوں کے ساتھ ہی زمین میں دفن ہو جائے۔ ہر زبان کے بولنے والوں نے اپنے خیالات اور نظریات کو ہر دور میں اپنی زبان کے ادب میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی کے علوم اور ادب تک ہماری دسترس کتابوں میں محفوظ اسی علمی ذخیرے کی وجہ سے ہی ہے۔ ان علوم و فنون سے استفادہ حاصل کرنے اور ان لوگوں کے خیالات سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں ان کے لکھے ہوئے الفاظ کو اپنی زبان کے آسان اور سہل الفاظ میں بدلنا ضروری ہے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ترجمہ کے فن نے جنم لیا۔ ترجمہ نہ صرف زبان و ادب کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے بلکہ انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے بھی متعارف ہوتا ہے۔

ترجمے کی ضرورت کو انیس ناگی یوں بیان کرتے ہیں:

”تراجم کا عمل انسانی تمدن، مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا بھرپور ذریعہ ہے، انسان جو رنگوں، زبانوں اور جغرافیائی بندشوں اور سیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے، ترجمے کے ذریعے ایک زبان کو اپنی زبان کے حروفِ تہجی میں ڈھالنے سے انسانی سطح پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتا ہے۔“(۱)

ترجمے کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے۔ ہر زبان کی اپنی پیچیدگیاں ہوتی ہیں اور اس کے الفاظ کے اصل پس منظر میں ان کی اصل روح تک پہنچنا ہی ترجمہ نگار کا کام ہے۔ اس لیے ترجمہ نگار کے لیے اس زبان کے مزاج سے واقف ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ مصنف کے خیالات کو آسانی سے اپنی گرفت میں لا سکے۔ اسی سے اظہار کے نئے وسائل بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ گویا مترجم خود کو کھو کر مصنف کی تلاش کرتا ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگ ترجمے کو ایک کم تر عمل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان کے بڑے اور اعلیٰ ادیب نے بھی ترجمہ کا سہارا ضرور لیا ہے۔ چوسر، ڈرائیڈن، ایلیٹ ہوں یا پھر انتظار حسین، فیض یا مجید امجد ہوں، سب کے ہاں تراجم موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترجمہ بھی تخلیق سے کم نہیں لیکن اس کو تخلیق کے ہم پلہ بنانے کے لیے اس کے کئی تقاضے ہیں۔ ایک بنیادی تقاضا ڈاکٹر خالد ندیم کی نظر میں یہ ہے:

”ترجمے کا بنیادی تقاضا کسی تصنیف کے خیالات و افکار کے ساتھ ساتھ اس تصنیف میں پوشیدہ تمام تر تہذیبی و ثقافتی رویے، مذہبی و سیاسی نظریات، معاشرتی و معاشی تصورات، لسانی و اسلوبیاتی خصوصیات حتیٰ کہ مصنف کے طرزِ احساس کی منتقلی ہے۔“(۲)

لفظ ”ترجمہ“، Translation کا مترادف خیال کیا جاتا ہے لیکن اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے دونوں میں فرق موجود ہے۔ اس فرق کو مرزا حامد بیگ اس طرح بیان کرتے ہیں:

”لفظ Translation دراصل لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں ”پار لے جانا“ اس مفہوم میں نقلِ مکانی اور نقلِ معانی دونوں مفاہیم کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ ترجمہ عربی کا لفظ ہے اور لغت میں اس کے معنی نقلِ کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیانِ احوال یا تذکرہ شخصی ہے۔“(۳)

اس تعریف کے مطابق لفظ Translation کے معنی ”پار لے جانا“ کے ہیں۔ یعنی قاری کو اصل عبارت کی مشکلات سے پار مصنف کے خیالات تک رسائی دینا۔ اس لحاظ سے اچھا مترجم وہی ہے جو صحیح معنوں میں قاری کو پار اتارے اور اسے اصل مصنف سے ملوائے۔ ایک زبان سے دوسری زبان کے پار اترنے میں کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ جھول باقی رہ ہی جاتی ہے۔ اسی لیے ”طبع زاد“ اور ”ترجمہ“ کی الگ الگ اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ اس بنا پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ترجمہ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

”کسی تحریر، تصنیف یا تصنیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ کسی متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اُس کی تعبیر کرتا ہے یعنی ترجمے کا عمل ایک علمی یا ادبی پیکر میں ڈھالنے کا عمل ہے۔“(۴)

ترجمہ اگر اپنے معیارات پر پورا اترتا ہو تو یہ خود ایک تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی زبان اپنے مزاج، جملوں کی ساخت اور محاورات کے لحاظ سے دوسری زبان سے الگ ہوتی ہے۔ جب مترجم کسی دوسری زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرتا ہے تو وہ اپنی زبان کو نہ صرف

ایک نئے مزاج سے روشناس کراتا ہے بلکہ اپنی زبان کو نئے خیالات، محاورات، الفاظ اور اظہار کے نئے نئے طریقے بھی فراہم کرتا ہے۔ جس سے زبان کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ ترجمے کی اہمیت کو جمیل جالبی یوں بیان کرتے ہیں:

''ترجمہ کی اہمیت یہی ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں جس سے ذہنی جذب و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسرے زبان کی قوتِ اظہار میں نئے امکانات پیدا ہونے لگتے ہیں اور وہ زبان بھی سنجیدہ خیالات کے بیانات پر قدرت حاصل کر کے احساس وخیال کی نئی نئی تصویریں ابھارنے کی اہل ہو جاتی ہے۔''(۵)

ذہنی جذب و قبول کے ساتھ نئے الفاظ اور خیالات کو اپنی زبان کا حصہ بنا دینا اتنا آسان کام نہیں کہ اسے ہر کوئی انجام دے سکے۔ جس طرح شاعری کے لیے آتش نے کہا تھا کہ

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اسی طرح ترجمہ بھی نگینوں کے جڑنے سے کم نہیں ہے۔ ایک لفظ کے متبادل اپنی زبان کا لفظ کوئی ''مرصع ساز'' ہی لگا سکتا ہے۔ جس کے لیے زبانوں کا گہرا علم اور دانش ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ترجمہ کی اہمیت اصل فن پارے سے کم نہیں بشرطیکہ مترجم پوری مہارت اور ریاضت کے ساتھ یہ کام انجام دے:

''ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لیے کہ اصل عبارت کو خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کم یاب ہوتی ہے۔ ترجمے بہت ملتے ہیں اچھے ترجمے خال خال ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جو دو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت اور افادیت مجروح ہو جاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔''(۶)

اب جب ہم ان لفظوں کے نگینوں کو تراجم کی صورت میں جڑا ہوا دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر فن کار نے اپنے اپنے انداز میں کارگری دکھائی ہے۔ کہیں لفظوں کے متبادل الفاظ کے انتخاب تک ہی ترجمے کو محدود رکھا گیا ہے تو کہیں اپنی زبان کے محاورے، روزمرہ، تشبیہات و استعارات اور ضرب الامثال کے ذریعے ترجمے میں چاشنی پیدا کر دی گئی ہے۔ تعلیمی میدان میں مخصوص اصطلاحات کے تحت بھی تراجم کیے گئے ہیں۔ صحافتی میدان میں بھی مفہوم پر مبنی تراجم کیے گئے ہیں۔ مختلف زبانوں کی شاعری کو بھی اپنی زبان میں ترجمہ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ گویا ترجمے کا فن ایک ایسا فن ثابت ہوا ہے کہ ہر تخلیق کار نے اپنے رنگ میں اسے پیش کیا ہے۔ پیش کش کے انداز کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ترجمے کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ علمی ترجمہ
۲۔ ادبی ترجمہ
۳۔ صحافتی ترجمہ

پہلی قسم کے ترجمہ میں باقاعدہ اصطلاحات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ہر جگہ ایک اصطلاح کا ترجمہ ایک ہی رہے۔ اس قسم کے تراجم عموماً سائنسی علوم کو اپنی زبان میں لانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ دوسری قسم کا ترجمہ یہ بات سوچ کر کیا جاتا ہے کہ اگر اصل مصنف اس بات کو ہماری زبان میں

بیان کرتا تو وہ اس کو کس طرح بیان کرتا۔ اسی خیال کے تحت مترجم اپنی زبان کے تمام فنی لوازم اور اصطلاحات سے مدد لیتا ہے۔ مصنف کے مزاج، ماحول اور معاشرتی پس منظر کو اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ تیسری قسم کے ترجمہ میں اس بات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ تحریر زیادہ سے زیادہ آسان اور عام فہم ہو۔ اس میں مترجم کے لیے کوئی پابندی نہیں ہوتی وہ جس طرح آسان سمجھے اسی طرح مفہوم کو بیان کرتا ہے۔ اندازِ بیان مختلف ہونے کی بنا پر بعض ادبا نے ترجمے کو لفظی، آزاد اور معتدل ترجمے کی اقسام میں بھی تقسیم کیا ہے۔ ترجمے کی ہر قسم میں مقصد صرف دوسری زبان کے علم و ادب کو اپنی زبان میں داخل کر کے نہ صرف اپنی زبان اور ادب کے ذخیرے کو وسعت دینا ہے بلکہ اپنی زبان کو نئے نئے خیالات سے مالا مال کرنا بھی ہے۔ ترجمے کے اس بنیادی مقصد کو ڈاکٹر نثار احمد قریشی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ”ترجمے کا بنیادی مقصد اصل متن کے خیال اور مفہوم کو مناسب الفاظ میں ادا کرنا ہے۔ ترجمہ ہمیں مختلف اقوام کی علمی و تہذیبی زندگی سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ہر زبان کی لسانی، ثقافتی اور ادبی گہرائی اور اس کے اسالیب سے بھی متعارف کراتا ہے۔“(۷)

ان مقاصد کے حصول کے لیے اصل متن کا انتخاب خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ترجمے کے لیے مواد کا انتخاب مترجم اپنی پسند، خواہش یا ضرورت کے تحت کرتا ہے۔ کوئی تحریر جب ایک پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لیتی ہے تو وہ داخلی طور پر اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ مترجم کا جو شعبہ ہو عموماً وہ اسی شعبے کی کسی اہم کتاب کو دوسری زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس میں اسے کئی عملی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاعری کا ترجمہ نثر میں یا نثر کا ترجمہ شاعری میں کرنے کے لیے پہلی دقت اسلوب کے انتخاب کی ہوتی ہے۔ اس سے آگے چلیں تو ہر شعبہ زندگی میں اصطلاحات بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان اصطلاحات کو اپنی زبان میں بدلنا بھی ایک اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات مصنف اور مترجم کا مزاج بھی نہ ملنے سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دونوں زبانوں کے مزاج کے فرق کی وجہ سے بھی مترجم کو دقت پیش آ سکتی ہے۔ بعض تراجم پر سیاسی اور معاشرتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ ایک زبان کے اندر بھی کئی دوسری زبانوں کے الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ جن کا پس منظر، لہجہ اور ان کا تلفظ اپنی اصل زبان کے مزاج کے مطابق اپنی زبان میں منتقل کرنا بھی مترجم کے لیے ایک اہم مسئلہ گنا جاتا ہے۔ زندگی کے مختلف پیشوں اور طبقات کی زبان اور ان کے الفاظ بھی کئی طرح سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کی اصل جاننا بھی مترجم کے لیے ضروری ہے۔ مذہبی تراجم میں ایک دقت الفاظ کی غرض و غایت کا جاننا بھی ہے۔ کیونکہ بظاہر ایک سادہ سا نظر آنے والا لفظ اپنی غرض و غایت کے لحاظ سے نہایت اہم بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ایسے الفاظ کا ترجمہ کرتے وقت ان کی اس غرض و غایت کا علم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اسی کے مطابق مترجم اپنی زبان کے الفاظ میں اس کو بیان کر سکے۔ اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں کہ جن سے ایک مترجم کا عملی طور پر واسطہ پڑتا ہے۔ ترجمہ کے وقت پیش آنے والے مسائل کو نصیر احمد نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ترجمے کے وقت جو مسائل سامنے آتے ہیں انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ادبی شاہکاروں کے ترجمے سے متعلق مسائل جس میں نثر اور شاعری دونوں شامل ہیں۔ دوسرے وہ مسائل جو علمی یا ٹیکنیکل مضامین کا ترجمہ کرتے وقت درپیش ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں مرکزی خیال، مجموعی تاثر، خیال کی شدت، تخیل کی پرواز، الفاظ کی نشست و برخاست، صوتی آہنگ، بحری تناسب اور ہیئت وغیرہ کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ جب کہ مسائل کی دوسری قسم میں مرکزی خیال، مجموعی تاثر، سیاق و سباق اور اصطلاحات پر ہماری توجہ ہوتی ہے۔“(۸)

گویا ترجمہ کرتے وقت مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو قائم رکھنا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ایک کامیاب ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ مترجم ان مسائل پر قابو پائے اور خود کو اصل تصنیف کے مجموعی تاثر سے باہر نہ نکلنے دے۔ اس کا واحد حل یہی ہے کہ مترجم کو اپنی زبان اور جس زبان سے ترجمہ کرنا مقصود ہے دونوں پر کامل عبور ہو۔ اس کی قابلیت ہی ان مسائل کا واحد حل پیش کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ سیّد باقر حسین نے ان مسائل کو کم کرنے اور ترجمے میں نکھار پیدا کرنے کے لیے چند اصول بھی وضع کیے ہیں:

"۱۔ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے۔ اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ ترجمہ حتی الامکان محاورہ زبان کے مطابق ہونا چاہیے۔

۳۔ الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔

۴۔ حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو، ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے، خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہو، تو ایسی صورت میں جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔"(۹)

ترجمے کی اہمیت کے پیش نظر مسائل کے باوجود کچھ لوگوں نے اس کے باقاعدہ اصول و ضوابط وضع کیے۔ پھر ان کی روشنی میں دنیا کو علم و ادب کی نئی راہیں دکھائیں اور تراجم کی ایک ایسی مستحکم روایت کی بنیاد رکھی جو آج بھی علم و ادب کے میدان میں وسعت کا سبب ہے۔ ترجمہ کو اصل تصنیف سے کم درجہ دینے والے بھی کم نہیں ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ پہلے پہل تو ترجمے کو گناہ سمجھا گیا اور مترجم کو نمک حرام اور غدار کا نام بھی دیا گیا۔ کئی مترجمین کو تو باقاعدہ اس "گناہ" کا مرتکب ہونے پر اپنی جان بھی گنوانا پڑی۔ اس "گناہ" اور اس کی سزا کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

"اس میں پہلا نام ۲۵۰ قبل مسیح کے لیویوس اینڈرونیکس کا ہی لیا جائے گا، جس نے اوّل اوّل ہومر کی "اوڈیسی" کو لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور تادیر گمنامی سے نباہ کیا۔ انگریزی میں بائیبل کے اوّلین مترجم ولیم ٹنڈل کی ساری عمر جلاوطنی میں گزری۔ پھانسی پائی اور اس کی لاش کو آگ میں جھونک دیا گیا۔ خود ہمارے ہاں ترجمہ قرآن کے بعد نذیر احمد دہلوی سے عالمانہ مذہبی تقدس بھی چھن گیا۔"(۱۰)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ ہماری زبان کے مزاج میں شامل ہے۔ جب ہم اپنے نثری سرمائے پر نظر کرتے ہیں تو ابتدائی نثری داستانیں اور دوسرا افسانوی ادب دوسری زبانوں سے ماخوذ یا ترجمہ شدہ نظر آتا ہے۔ اس میں باغ و بہار، آرائشِ محفل یا داستانِ امیر حمزہ ہو یا یلدرم کی خیالستان۔ سب میں تراجم کا حسن اور ماخوذ مواد اور خیالات کا خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔ اردو میں نئی اصناف کا اضافہ بھی تراجم کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔ تنقید، ڈراما، ناول اور افسانے جیسی اصناف تراجم کے راستے ہی اردو زبان میں داخل ہو کر اس کا حصہ بن گئی ہیں۔ اردو کے ارتقا میں دوسری زبانوں اور بولیوں سے تراجم کی اہمیت کو ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے یوں بیان کیا ہے:

"اُردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت، ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلمکار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا

ہاتھ ہے۔ کہیں یہ ترجمے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال، استعارے اور اصطلاحوں کی صورت میں۔ تاریخ دہرانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ بہر حال یہ مسلّمہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجمے اور ترجمانی کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔"(۱۱)

ترجمے کی روایت ہومر کی "اوڈیسی" سے شروع ہوئی اور پھر دنیا بھر میں ہر زبان سے دوسری زبان میں تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اردو ادب میں تراجم کی روایت گو کہ زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن اس روایت کی عمر خود زبانِ اردو کے برابر متصور ہوتی ہے۔ اردو میں تراجم کی اس روایت کو انفرادی طور پر بھی اور مختلف ادوار میں باقاعدہ تراجم کے لیے ادارے قائم کر کے بھی مستحکم کیا گیا۔ اس روایت کی ابتدا، ۳۶۔۱۶۳۵ء میں ملاوجہی نے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کے مشہور قصے "حسن و دل" کو "سب رس" کے نام سے ترجمہ کر کے کی۔ لیکن ڈاکٹر سہیل احمد کے مطابق:

"ملاوجہی نے ۱۶۳۵ء میں "سب رس" لکھی جو دکنی زبان سے ترجمہ کی گئی تھی۔ محققین کا خیال ہے کہ "سب رس" شاہ جی نیشاپوری کی فارسی کتاب "دستور عشاق" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کو اردو زبان کی پہلی رزمیہ تحریر بھی کہا جاتا ہے۔ نصیر الدین کی تحقیق کے مطابق ملاوجہی نے وجیہ الدین کی گجراتی کتاب کو "سب رس" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ ایک اور تحقیق کے مطابق اپنے زمانے کے صوفی اور شاعر شاہ جی (۱۴۹۶۔۱۵۶۱ء) کی کتاب خدا نما (دکن) اردو میں ترجمہ کی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ میران جی کا تعلق قطب شاہی زمانے سے تھا۔ حامد حسن قادری صاحب، شاہ میران جی کے اس ترجمے کو مشہور عربی مصنف ابو الفضائل عبد اللہ بن محمد عین القضاۃ کی تصنیف "تمہیدات ہمدانی" کا ترجمہ بتاتے ہیں جو ۱۶۰۳ء میں رقم ہوا۔"(۱۲)

اوّلین ترجمے کی بحث سے ہٹ کر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ سب رس اور خدا نما نے اردو تراجم کی روایت کو ایک مستحکم بنیاد فراہم کی۔ انفرادی طور پر تراجم کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب تراجم کی یہ لہر شمالی ہند پہنچی تو فضل علی فضلی نے ۳۳۔۱۷۳۲ء میں کمال الدین حسین بن علی الواعظ الکاشفی کی مشہور کتاب "روضۃ الشہدا" کو "کربل کتھا" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اسی دور میں میر عطا حسین خان تحسین نے فارسی کے "قصہ چہار درویش" کو "نو طرزِ مرّصع" کے نام سے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اردو تراجم کی اس روایت میں ایک اہم نام ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا بھی ہے جنھوں نے اپنی کتاب "ہندوستانی زبان کے قواعد" مطبوعہ کلکتہ، طبع اوّل ۱۷۸۶ء میں ولیم شیکسپیئر کے دو ڈراموں "ہیملٹ" اور "ہنری ہشتم" کے دو چیدہ اقتباسات کا اُردو ترجمہ پیش کیا تھا۔"(۱۳)

اردو میں تراجم کی باقاعدہ ایک منظم روایت کا آغاز ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوتا ہے، جب کمپنی نے اپنی سیاسی اور انتظامی ضرورت کے تحت مختلف ادبا سے فارسی، عربی، سنسکرت اور دوسری زبانوں کے نثری ادب کو اردو میں ترجمہ کرانا شروع کیا۔ جہاں پر میر حسن نے قصہ چہار درویش کو "باغ و بہار" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جب کہ کمال الدین حسین بن علی الواعظ الکاشفی کی "اخلاقِ محفی" کو "گنج خوبی" کے نام سے تحریر کیا۔ ان کے علاوہ شیر علی افسوس نے "باغِ اردو" اور "آرائشِ محفل"، بہادر علی حسینی نے "رسالہ گل کرسٹ" اور "نثر بے نظیر"، مظہر علی خان ولا نے "ترجمہ پند نامہ منظوم" اور "بے تال پچیسی"، خلیل خاں اشک نے "داستان امیر حمزہ"، حیدر بخش حیدری نے "آرائشِ محفل" اور "گلِ مغفرت"، جیسی کتب تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ انگریز مؤلفین نے بھی اردو اور چند دوسری زبانوں میں کتب ترجمہ کر کے شائع کیں۔ کمپنی نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے یہ کام ۲۰ سال تک جاری رکھا۔ اس کے بعد کالج کو بند کر دیا گیا اور تراجم کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

۱۸۲۵ء میں ریاضی، سائنس اور فلسفہ و ادب کی تدریس کے لیے دہلی میں "دہلی کالج" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جہاں عربی اور سنسکرت میں کچھ کتابوں کے تراجم بھی ہوئے مگر انگریزوں نے انگریزی زبان پر زیادہ توجہ دی۔ جس کی وجہ سے یہ کالج متنازعہ بن گیا اور اس کے قیام کے اصل مقاصد حاصل نہ ہو سکے۔ دہلی کالج کی علمی و ادبی کوششوں میں ایک نام "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" کا ہے۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم ہوئی اور دہلی کالج میں ہی اس نے ترجمے اور تالیف کا کام جاری رکھا۔ "غدر سے پہلے تک اس نے ایک سو سترہ کتابیں ترجمے اور تصنیف و تالیف کے ذریعے تیار کر لی تھیں۔"(۱۴) فورٹ ولیم کالج کے بعد اس سوسائٹی نے صحیح معنوں میں اردو کے ذخیرے میں اضافہ کیا اور متنوع موضوعات سے اردو نثر کا دامن وسیع کیا:

> "دہلی ورنیکلر سوسائٹی نے اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر کا دامن وسیع کرنے میں جو اہم خدمات انجام دیں اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں اردو میں متنوع مضامین اور موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کر دیں اور اسی روایت نے آگے چل کے اردو نثر کی روایت کو اتنا فروغ دیا کہ بقول مہدی افادی "یہ کل کی چھوکری یورپ کی بڑی زبانوں سے آنکھ ملانے کے لائق ہو گئی۔"(۱۵)

جنگِ آزادی کے بعد اردو اور اس کی تدریس کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سرسید احمد خان نے "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی۔ "اس ادارہ کا بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کی علمی کتابوں کے تراجم کو رواج دینا اور ایک نیا علمی اور عقلی انداز نظر پیدا کرنا تھا۔"(۱۶) جب سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوا تو سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ میں منتقل ہو گیا۔ جہاں پر سرسید نے اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ مل کر اپنے کام کو جاری رکھا۔ "مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔"(۱۷) لیکن ڈاکٹر اصغر عباس نے سرسید احمد خان اور سوسائٹی کے دوسرے ممبران کے کتب کی اشاعت کے بارے میں اپنائے گئے اصول کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ "سوسائٹی سے صرف پندرہ کتابیں شائع ہوئیں۔"(۱۸) بعض ایسے ادبا نے جو سوسائٹی کے ممبر تو نہیں تھے لیکن سوسائٹی کے مقاصد کے پیشِ نظر انھوں نے بھی کئی کتب کے تراجم اپنے طور پر بھی شائع کرائے۔ ان میں ایک اہم نام مولوی ذکاءاللہ کا ہے۔

کلکتہ، دہلی اور علی گڑھ سے نثری تراجم کی یہ روایت لاہور پہنچی تو اردو نظم کے موضوعات میں وسعت لانے کے لیے ۱۸۶۵ء میں لاہور میں "انجمن پنجاب" کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کے سیکرٹری مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے تحت انگریزی شاعری کے متعدد ترجمے ہوئے۔(۱۹) اردو نظم کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی اور گل و بلبل اور عشق و عاشقی کے روایتی غزلیہ موضوع سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے موضوعات اور مضامین کو نظم کا حصہ بنایا گیا۔ اردو کی اشاعت و ترویج کے لیے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں "انجمن ترقی اردو" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا دفتر دہلی منتقل ہوا تو یہ "انجمن ترقی اردو ہند" اور قیامِ پاکستان کے بعد جب دفتر کراچی منتقل ہوا تو اس کا نام "انجمن ترقی اردو پاکستان" ہو گیا۔ آغاز میں شبلی نعمانی اس کے معتمد مقرر ہوئے جنھوں نے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو میں کرائے۔"(۲۰) قیامِ پاکستان سے اب تک بھی انجمن نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر طبع زاد کتب اور تراجم شائع کیے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کا مقصد بھی مختلف زبانوں کی علمی و ادبی کتب کا ترجمہ کرنا تھا۔ شبلی کی ان کوششوں سے ترجمے کے کام کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ ترجمے کے اس تسلسل کو جامعہ عثمانیہ کے "دارالترجمہ" نے مزید آگے بڑھایا۔ اصطلاحات سازی کے حوالے سے بھی اس ادارے نے اہم کارنامے انجام دیے۔ وحیدالدین سلیم کی تالیف "وضع اصطلاحات" آج بھی

سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے زیرِ اثر بھی مختلف ادبانے تراجم کی روایت کو خوب نبھایا۔ اس سلسلے میں میرا جی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

ان اداروں کی اجتماعی کوششوں کے علاوہ بھی ادبانے ادب کے ہر شعبے میں اپنے اپنے طور پر تراجم کے ذریعے اردو ادب کے دامن کو وسعت دی۔ ناول کے میدان میں عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، عبدالمجید سالک، اشفاق احمد، حسن عسکری، ابنِ انشاء اور ممتاز شیریں جیسے ادبانے مغربی ناول کو اردو میں متعارف کرا کر اردو ناول نگاری کو نئے خیالات اور موضوعات سے مالا مال کیا۔ منٹو، پریم چند، غلام عباس، حجاب امتیاز علی، اختر حسین رائے پوری، جاوید صدیقی، سید وقار عظیم، انتظار حسین اور حامد اللہ افسر جیسے ادیبوں نے اردو افسانے کو مغربی افسانے سے ترجمے کے ذریعے ہی اردو کا حصہ بنایا۔ انگریزی ادب سے سفر ناموں کو بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں مرتضیٰ احمد خان میکش، سید رشید الدین اور محسن بشیر کے نام اہم ہیں۔ انگریزی، یونانی اور ترکی ڈرامے کو بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ڈراموں کو ترجمہ کرنے والوں میں شان الحق حقی، ڈاکٹر عابد حسین، انصار ناصری اور احمد عقیل روبی کے نام اہم ہیں۔ منظوم تراجم میں حالی، اکبر الہ آبادی، طباطبائی، اقبال، فیض، فراز، جوش اور عقیل روبی جیسے شعرا نے طبع آزمائی کی۔ تراجم کو قبولیت کی سند دلانے میں رسالہ "دلگداز" اور رسالہ "مخزن" کا کردار بھی نمایاں رہا۔ اس وقت بھی کئی ادبی رسائل تراجم کو اپنی اشاعت کا حصہ بنا رہے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت بھی کئی سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ترجمہ نگاری کے کام میں مصروف ہیں۔ ان اداروں میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان کراچی، نیشنل بک کونسل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اکادمی ادبیات اسلام آباد، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، مجلس زبان دفتری پنجاب لاہور، ادارہ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب لاہور، ترقی اردو بورڈ کراچی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، لوک ورثہ اسلام آباد، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، مجلس ترقی اردو لاہور، مکتبہ فرینکلن لاہور اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی شامل ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ ہر صوبے میں موجود ادبی اکیڈمیاں بھی علاقائی ادب کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے شائع کر رہی ہیں۔

اس وقت عالمی سطح پر بھی ترجمے کی اہمیت کے پیش نظر کئی ادارے ترجمہ نگاری کا کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں ایک ادارہ "International Federation of Translators" کے نام سے قائم ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۵۳ء میں قائم ہوا تھا۔ جو اس وقت ۵۵ سے زائد ممالک میں کام کر رہا ہے۔ یہ ادارہ دنیا بھر کی مختلف زبانوں کو دوسری زبانوں میں نہ صرف ترجمہ کرتا ہے بلکہ اصطلاحات سازی کا کام بھی کرتا ہے۔ ۱۹۹۱ء سے ہر سال ۳۰ ستمبر کو باقاعدہ "انٹرنیشنل ٹرانسلیشن ڈے" بھی منایا جاتا ہے۔ یہ ادارہ "BABEL" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کرتا ہے جس میں تراجم کے ساتھ ساتھ فنِ ترجمہ نگاری کے حوالے سے محققین کے مقالے بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں کمپیوٹر میں بھی ترجمے کے لیے کئی ایسے سافٹ ویئر آچکے ہیں جن کی مدد سے دنیا کی کسی بھی زبان کے علم و ادب کے فن پاروں کو اردو زبان میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تراجم لفظی اور بامحاورہ تو ہوتے ہیں مگر لفظوں کے پردے میں مصنف کے خیالات اور جذبات کو سامنے لانے سے ابھی قاصر ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حواشی و حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی: ترجمے کی ضرورت: مشمولہ، تراجم کے مباحث (مرتب): از محمد ابو بکر فاروقی: کراچی، سٹی بک پوائنٹ: ۲۰۱۶ء: ص ۲۱

۲۔ خالد ندیم، ڈاکٹر: ترجمے کا فن: مشمولہ، "فنون"، لاہور: شمارہ ۱۳۲: جنوری تا جون ۲۰۱۲ء: ص ۱۳۴

۳۔ حامد بیگ، مرزا: مغرب سے نثری تراجم: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان: ۱۹۸۵ء: ص ۲۰

۴۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر: ترجمے کا فن: مشمولہ، تراجم کے مباحث (مرتب): از محمد ابو بکر فاروقی: ص ۱۰۸

۵۔ جمیل جالبی:ترجمے کے مسائل:مشمولہ،ترجمہ کا فن اور روایت(مرتبہ):از ڈاکٹر قمر رئیس:کراچی،سٹی بک پوائنٹ:۲۰۱۶ء:ص۷۹
۶۔ شہباز حسین:ترجمہ کی اہمیت:مشمولہ،ترجمہ کا فن اور روایت(مرتبہ):از ڈاکٹر قمر رئیس:ص۱۲۴
۷۔ قریشی،نثار احمد،ڈاکٹر(مرتب):صوفی غلام مصطفیٰ تبسم،حیات و خدمات:اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان:۲۰۰۸ء،ص۲۳۸
۸۔ نصیر احمد:ترجمہ اور لسانیات:مشمولہ،ترجمہ کا فن اور روایت(مرتبہ):از ڈاکٹر قمر رئیس:ص۸۵
۹۔ باقر حسین،سیّد:ترجمے کے اصول:مشمولہ،تراجم کے مباحث(مرتب):از محمد ابو بکر فاروقی:ص۵۲
۱۰۔ حامد بیگ،مرزا،ڈاکٹر:اردو میں ترجمے کی روایت:مشمولہ،تراجم کے مباحث(مرتب):از محمد ابو بکر فاروقی:ص۲۶۰
۱۱۔ ظ۔انصاری،ڈاکٹر:ترجمے کے بنیادی مسائل:مشمولہ،تراجم کے مباحث(مرتب):از محمد ابو بکر فاروقی:ص۱۸۳
۱۲۔ سہیل احمد،ڈاکٹر:ترجمہ نگاری،چند پہلو:مشمولہ،تراجم کے مباحث(مرتب):از محمد ابو بکر فاروقی:ص۱۲۹
۱۳۔ حامد بیگ،مرزا،ڈاکٹر:اردو میں ترجمے کی روایت:مشمولہ،تراجم کے مباحث(مرتب):از محمد ابو بکر فاروقی:ص۲۶۱
۱۴۔ ضمیر حسن،سید:دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی:مشمولہ،ترجمہ کا فن اور روایت(مرتبہ):از ڈاکٹر قمر رئیس:ص۲۱۴
۱۵۔ ایضاً۔ص۲۱۶
۱۶۔ اصغر عباس،ڈاکٹر:سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم:مشمولہ،ترجمہ کا فن اور روایت(مرتبہ):از ڈاکٹر قمر رئیس:ص۱۴۶
۱۷۔ ایضاً۔ص۱۵۵
۱۸۔ ایضاً۔ص۱۵۶
۱۹۔ قریشی،نثار احمد،ڈاکٹر(مرتب):صوفی غلام مصطفیٰ تبسم،حیات و خدمات:ص۲۳۹
۲۰۔ ایضاً۔ص۲۳۹

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havashi-o-Havalajat

1. Anees Nagi: Tarjamay ki zarorat: mashomola, trajam kay mabahis (muratab): az Muhammad Abu Bakar Faroki: Karachi, City Book Point: 2016, P 21
2. Khalid Nadeem, Dr.: Tarjamay ka Fun: mashomola, Fanoon, Lahore, Shomara 123, January ta june2012, P 134
3. Hamad Baig, Mirza: Maghrab sy nasri trajam: Islamabad, muqtadira kaumi zuban: 1985, P 20
4. Hamad Baig, Mirza, Dr.: Tarjamay ka Fun: mashomola, trajam kay mabahis (muratab): az Muhammad Abu Bakar Faroki: P 108
5. Jamil Jalbi: Tarjamay kay Masail: mashomola, Tarjama ka Fun aur rawayat (muratab): az Dr. Qamar Raees: Karachi, City Book Point: 2016, P 79
6. Shahbaz Hussain: Tarjama ki eahmiat: mashomola, Tarjama ka Fun aur rawayat (muratab): az Dr. Qamar Raees: P 124
7. Qurashi, Nisar Ahmed, Dr. (muratab): Sufi Ghulam Mustafa Tabassam, Hayat o Khidmaat: Islamabad, muqtadira kaumi zuban: 2008, P 238
8. Naseer Ahmed: Tarjama aur lisaniat: mashomola, Tarjama ka Fun aur rawayat (muratab): az Dr. Qamar Raees: P 85
9. Baqir Hussain, Sayed: Tarjamay kay Asool: mashomola, trajam kay mabahis (muratab): az Muhammad Abu Bakar Faroki: P 52
10. Hamad Baig, Mirza, Dr.: Urdu main Tarjamay Ki Rawayat: mashomola, trajam kay mabahis (muratab): az Muhammad Abu Bakar Faroki: P 260
11. Zoay-Ansari, Dr.: Tarjamay Kay Bunyadi Masail: mashomola, trajam kay mabahis (muratab): az Muhammad Abu Bakar Faroki: P 183

12. Sohail Ahmed, Dr.: Tarjama Nigari, Chand Pahlu: mashomola, trajam kay mabahis (muratab): az Muhammad Abu Bakar Faroki: P129
13. Hamad Baig, Mirza, Dr.: Urdu main Tarjamay Ki Rawayat: mashomola, trajam kay mabahis (muratab): az Muhammad Abu Bakar Faroki: P 261
14. Zameer Hassan, Sayed: Delhi Vernacular Translation Society: mashomola, Tarjama ka Fun aur rawayat (muratab): az Dr. Qamar Raees: P 214
15. Eizan: P 216
16. Asghar Abbas, Dr.: Sir Sayed ki Scientific Society kay Trajam: mashomola, Tarjama ka Fun aur rawayat (muratab): az Dr. Qamar Raees: P 146
17. Eizan: P 155
18. Eizan: P 156
19. Qurashi, Nisar Ahmed, Dr. (muratab): Sufi Ghulam Mustafa Tabassam, Hayat o Khidmaat: P 239
20. Eizan: P 239